اصول فقہ میں الفاظ کی بحث اور جدید لسانیاتی فلسفہ

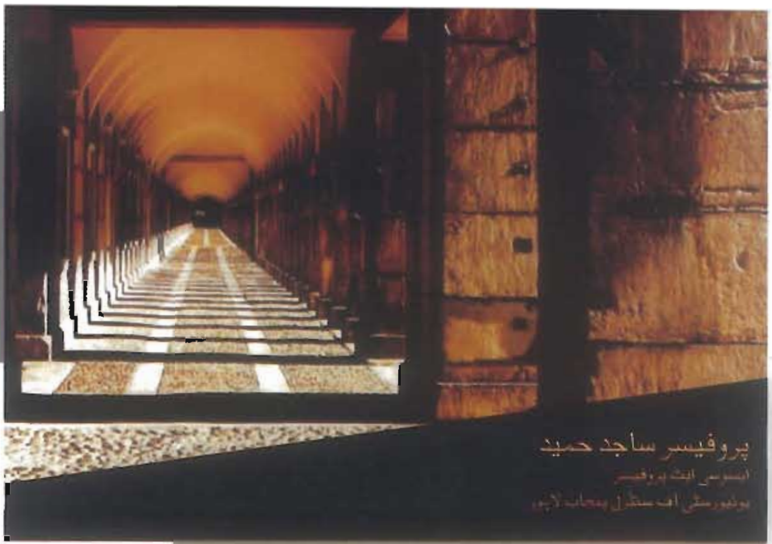

پروفیسر ساجد حمید
ایسوسی ایٹ پروفیسر
یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب لاہور

مغرب میں لسانیات پر گاہے بگاہے بات ہوتی رہی ہے، مگر دورِ جدید میں، جو بحثیں شروع ہوئیں ان کا تعلق ان نظریات سے ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ قدیم مسلمان ماہرین کی طرح ان لسانی بحثوں میں بھی ایک بحث الفاظ کی اپنے معنی پر دلالت سے متعلق ہے۔ کلام کی دلالت کے بارے میں اس مختصر سی تحریر میں ہم بحث کو ایک بنیادی نقطہ میں محدود رکھیں گے اور وہ یہ ہے کہ آیا کلام اپنے مصنف کے مدعا تک راہنمائی کرتا ہے تو کس درجے کی۔ اس موضوع میں بھی ہماری گفتگو قرآن کے حوالے سے ہوگی۔ قدیم مسلمان ماہرین کے ہاں عموی طور پر یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ الفاظ کی دلالت اپنے مدعا پر ظنی ہوتی ہے۔ مثلا امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

دلالة الألفاظ على معانيها ظنية (۱) ''الفاظ کی دلالت اپنے معنی پر ظنی ہوتی ہے''۔

اور صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

> أن الدليل العقلي أقوى دلالة من الدليل السمعي لأن دلالة الأول قطعية ودلالة الثاني ظنية غالبا للاحتمالات الشهيرة التي لا يمكن القطع معها (۲)
>
> ''عقلی استدلال سمعی استدلال کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، کیونکہ عقلی استدلال قطعی ہے اور سمعی ظنی ہے، ان مشہور احتمالات کی وجہ سے، جن کے پائے جانے کی وجہ سے قطعیت کا حصول ممکن نہیں رہتا''۔

ان بحثوں کے اثرات، اہل فقہ پر بھی پڑے لہٰذا انھوں نے الفاظ کی دلالت پر بحث کر کے ان مسائل کا حل نکالا اور قواعد ترتیب دیے۔ اسی طرح انھوں نے نصوص کی دلالت کی نوعیت پر بھی گفتگو کی تاکہ فقہ کا طالب علم صحیح طور پر مناظرہ کی اس گفتگو کا سامنا کر سکے کہ الفاظ و جمل کی اپنی معنی پر دلالت کی کیا حقیقت ہے۔ چنانچہ بالعموم اصول فقہ کی کتب میں دیگر لغوی مباحث کے ساتھ ساتھ یہ مباحث بھی ملیں گے کہ الفاظ دلالت کے اعتبار سے کتنی قسم کے ہیں، فقہاء نے انہیں (بترتیب صعودی) درج ذیل میں بانٹا ہے: مجمل، مشکل، خفی، ظاہر، نص، مفسر اور محکم (۳) یہ مباحث ان کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں کہ دلالت کتنی قسم کی ہوتی ہے۔ جیسے احناف کے ہاں: عبارت، اشارت، دلالت، اقتضا (۴) اور شوافع کے ہاں دلالت صریحہ اور غیر صریحہ (۵) وغیرہ۔

ہمارے اسلاف نے یہ گفتگو یہاں سے اٹھائی تھی کہ

۱- (اگرچہ زبان کا ایک بڑا حصہ متواتر ہوتا ہے لیکن) زبان کا انتقال اور الفاظ کے معنی کی تحقیق اول آحاد پر منحصر ہے اور آحاد کی خبر ظنی ہوتی ہے۔

۲- قرآن مجید کا کلام مجاز اور حقیقت پر مشتمل ہوتا ہے، اس کا تعین مشتبہ ہے، جو ظن پیدا کرتا ہے۔

۳- قرآن مجید کی آیات محکم بھی ہیں اور متشابہ بھی، ان آیات کا تعین غیر توقیفی ہے اور سامع کے فہم پر منحصر ہے، یہ امر بھی قرآن کے مفہوم کے قطعی ہونے میں مانع ہے۔

۴- یہ اجماع سے ثابت ہے کہ قرآن مجید میں آیات کا نسخ ہوا ہے، لیکن ناسخ و منسوخ کا علم زیادہ تر اخبارِ آحاد کے ذریعے سے ہم تک منتقل ہوا ہے، سو یہ معاملہ بھی ظنی ہوا۔

۵- امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الرسالہ میں یہ لکھا ہے کہ قرآن کے الفاظ کا عموم و خصوص قرآن پر منحصر رہتے ہوئے متعین کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا فقیہ حدیث و سنت کا محتاج ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کلامِ الٰہی سے قطعی معنی میں اخذ مفہوم ممکن نہیں ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی دلالت اپنے مفہوم میں مظنون ہے (۶) دورِ جدید میں علمائے لسانیات کے ہاں یہ بحث کسی اور رنگ میں اٹھی ہے۔ اس تحریر میں ان سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ میری اس تحریر کا مقصد، ان مباحث

سے آگاہ کرنا نہیں ہے، بلکہ میں فقہ قرآن کے تناظر میں، ایک اور پہلو کی طرف اہل علم کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اہل مغرب کے ہاں مسئلے کی نوعیت کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے میں یہاں صرف ایک آدمی کا نقطۂ نظر اختصار کے ساتھ بیان کر رہا ہوں، اس کے بعد میں ان امور کی وضاحت کی طرف بڑھ جاؤں گا، جو قرآن مجید نے دلالت میں ظن سے بچنے کے لیے اختیار کیے ہیں۔

مغربی اصول تفسیر(hemenutics) میں ایک بڑا نام گاڈامر Gadamer کا ہے۔ اس کے نزدیک کسی عبارت میں صرف عمل یا تعامل (text or act) نہیں ہے بلکہ دو چیزیں ہیں:

۱- عبارت یا عمل (text or act) جسے سمجھا جانا ہے۔

۲- وہ لوگ جو اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں(interpreter)

گویا معنی عبارت یا عمل میں بالقوۃ پائے جاتے ہیں، لیکن وہ تعبیر کا جامہ اس وقت پہنتے ہیں، جب کوئی سمجھنے والا اسے سمجھے۔ چنانچہ جتنے مفسر کسی کلام کو ملتے جائیں گے اتنے معنی اس میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ چنانچہ اس طرح کی بحثوں میں ماہرین لسانیات اور لسانی فلاسفر آج بھی محو بحث ہیں۔ اہل مغرب کی فہم کلام سے متعلق ساری بحث محض انسانی سطح کے علم پر کھڑی ہے۔ اس لیے یہاں ہر قدم پر غلطی کے پائے جانے کا امکان ہے۔ اس لیے کہ ہر انسانی علم جو علم کے درجے کو پہنچتا ہے وہ دو چیزوں پر قائم ہوتا ہے: ایک شواہد (data) اور ان سے متعلق مفید مطلب معلومات اور دوسرے ان شواہد سے حاصل کردہ تجزیاتی نتیجہ۔

اگر شواہد کے استقصا میں غلطی ہو، تب بھی نتائج غلط نکل آتے ہیں اور اگر تجزیہ میں آدمی چوک جائے تو اس صورت میں بھی نتائج مبنی برحقیقت نہیں رہتے۔ شواہد کی غلطی دو طرح کی ہوتی ہے: شواہد کا استقصا مکمل نہیں ہوا، یا شواہد کے تمام پہلو سامنے نہیں آئے۔ اور تجزیے میں بھی غلطی کا امکان ہے وہ یہ کہ تجزیہ کرتے وقت کسی چیز کی کم اہمیت تھی لیکن تجزیہ کرنے والے نے اسے زیادہ اہمیت دے دی، جس کی وجہ سے شواہد کے کسی اہم پہلو پر نظر نہیں پڑی، چنانچہ نتائج خلاف حقیقت نکل آئے۔

ارسطو کا ایک نتیجہ فکر میں یہاں بطور مثال پیش کروں گا، تاکہ یہ بات سمجھ میں آئے کہ شواہد اور نتائج کا جو رشتہ انسان جوڑتے ہیں، وہ نہایت اعلیٰ ذہانت کے باوجود غلط ہوسکتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ عمل تولید میں عورت کا صرف اتنا حصہ ہے جتنا مٹی کا بیج کی نشوونما میں۔ یہ بات ارسطو نے اس لیے کی کہ اس نے نطفے کی بوند سے ایک بچے کے بننے کے عمل کو بیج سے پودا بننے کے عمل پر قیاس کیا۔ یہاں اس سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے ماں کے بچے میں خدوخال کے شاہد (evidence) کو کم اہمیت دی، اور غلط نتیجہ نکال لیا۔ حالانکہ انسان نسل در نسل دیکھ رہے تھے کہ بچے ماں اور باپ دونوں کے خدوخال اپنے اندر لیے ہوتے ہیں، کبھی ایک کے زیادہ اور کبھی دوسرے کے، اس لیے ماں کا بچے کی ولادت میں نشوونما سے بڑھ کر بھی کوئی حصہ ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مرد کا نطفہ تو اس کے لیے شاہد کے طور پر موجود تھا، مگر عورت کا نطفہ(egg) اس کے مشاہدے میں نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ماں کو مٹی پر قیاس کرلیا۔ اگر اسے عورت کے نطفہ کا مشاہدہ بھی ہوتا، تو وہ غلطی نہ کرتا۔ اس مثال میں بیک وقت غلطی لگنے کے دونوں اسباب جمع ہیں: یعنی شواہد کا ادھورا استقصا، اور شواہد کے ایک پہلو کو فراموش کرنا اور دوسرے کو اہمیت دے دینا۔

دور جدید کے ماہرین لسانیات سمیت تمام علوم کے نتائج کی یہی حقیقت ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسری بہت سی چیزیں بھی ان نتائج کے حق میں دکھائی دیتی ہیں، جس سے اہل علم یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے حق دریافت کرلیا ہے، اور کچھ دیر کے بعد کوئی اور چیز ایسی دریافت ہو جاتی ہے، جس سے اس چیز کی غلطی واضح ہوجاتی ہے۔ یہی صورت ہر انسانی علم کی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک اس کی غلطی واضح نہ ہو، اس پر عمل پیرا رہے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے چھوٹی بڑی سب ذہانتیں اس کی اسیر ہوجاتی اور اس کے تحت علم وتحقیق اور عملی کاوشوں کی بنیاد رکھتی ہیں۔

حق یہ ہے کہ انسانی علم کی دو سطح ہیں، ایک خود شواہد اور ان کے خواص کا علم، اور دوسرے ان شواہد خواص کے نتائج۔ پہلا علم بڑی حد تک صحیح ہوتا ہے۔ مثلاً اوپر ہم نے Gadamer کی رائے نقل کی ہے۔ اس رائے میں یہ بات کہ:

۱۔ کلام کے معنی سمجھنے والا ہوگا تو اس کا مفہوم سامنے آئے گا، واضح حقیقت ہے، اور

۲۔ کلام کے معنی مختلف لوگ مختلف نکالتے ہیں، یہ بھی عام تجربہ ہے

۳۔ کلام میں معنی شارح کے لحاظ سے اضافیت کے حامل ہیں اور کلام کے ادائے معنی کی قوت(potential) دو امور (text and interpreter) پر منحصر ہے، یہ وہ نتیجہ ہے، جو غلط بھی ہوسکتا ہے اور درست بھی، اس لیے کہ اگر متن کے وجود میں ایسے اوصاف موجود ہوں، جو شارح کی غلطی کو متعین کرنے میں ممد معاون ہوں تو گاڈامر کا نظریہ باطل ہوگا کہ مفہوم کلام میں شارح کے لحاظ سے اضافیت کا حامل ہے۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ ایک عبارت کا مطلب لینے والوں نے کیا مطلب اخذ کیا، اور خود عبارت کیا کہہ رہی ہے یہ بالکل دوسری بات ہے۔ گاڈامر نے جو یہ نتیجہ نکالا، تو مطلب نکالنے والوں کے عمومی مظاہرہ سے متاثر ہو کر

نکالا، اس نے کلام کی قوت کو بالکل کمزور جانا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے زیرِ مطالعہ کلام ہی ایسے تھے کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا، یا ارسطو کی طرح اس نے ایک ظاہر کو زیادہ اہمیت دے دی اور دوسرے کو کم۔

ہمارے خیال میں تعیین معنی کی اس بحث میں دونوں کی اہمیت ہے، لیکن معنی نکالتے وقت اصل اہمیت اس کلام کی ہے۔ اگر ہم کلام اور شارح دونوں کو برابر کی اہمیت دے دیں تو یہ کلام کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ انصاف یہ ہے کہ کلام کے قرائن وشواہد کو فیصلے کی بنیاد بنایا جائے، نہ کہ شارح کے ذہنی جمود وحرکت کو۔ اس لیے کہ شارح کا جمود اور حرکت دونوں کلام کو غلط انداز سے لے کر معنی پہنا سکتے ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر ہے:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یہ شعر اجڑے دلی کا آشوب نامہ ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے غم ٹپکتا ہے۔ لیکن ایک مردم بیزار شخص کل اس کی شرح یوں کرے کہ:

یہ شعر نہایت انبساط کا بیان ہے، اور دیکھو اس میں جوش کا لفظ اسی بات پر دلالت کررہا ہے۔ دلی اگرچہ اجڑا ہوگا، لیکن غالب کو سنسان دیار سے ایک شغف تھا، اس نے یہ کہا کہ دیکھو اب دلی کیا سکون کی جگہ ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں بستا، جس سے ہر طرف سکون تاریکی اور راحت ہے۔ اور یوں کہو کہ غالب اندھیروں کا رسیا اور آشوب کا دلدادہ ہے، اس لیے کہ سونیاں ہو جن گلیاں تے وچ مرزا یار پھرے۔ (گلیاں لوگوں سے خالی ہو جائیں اور مرزا ان میں مزے سے بلا روک ٹوک پھرے، اور مجھے ملاقات کے مواقع میسر آئیں)۔

یہ مثال میں نے اس لیے دی ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ کلام کی داخلی قوت کو سامنے لاؤں، جو معنی کے تعدد اور اضافیت پر قدغن لگاتی ہے۔ اگرچہ شاعری اور اس میں غزل جیسی صنف کے بارے میں ہم یہ بات جانتے ہیں کہ ان میں تعدد معنی اور شارح کے لحاظ سے اضافیت کسی حد تک ہوتی ہی ہے۔ لیکن پھر بھی اس اضافیت اور تعدد کے امکان کے باوجود، اس میں ہر طرح کے معنی لینے کا امکان نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم غالب کے مذکورہ بالا شارح کو کہیں گے کہ اس نے جوش کے لفظ سے خوشی کے معنی غلط اخذ کیے ہیں، اس سے زیادہ قوی قرائن غم کے حق میں موجود ہیں۔ جیسے ظلمت کدہ، شب غم، شمع کی خموشی یہ اردو زبان کی ادبی روایت میں غم اور منفی پہلو سے متعلق ہیں، اور جوش کا لفظ یہاں غم کی زیادتی اور تیزی کو ظاہر کرنے کے لیے مبالغہ کے مفہوم کو پیدا کرنے کے لیے بولا گیا ہے۔ اس لیے یہ شعر دلی سے متعلق ہو یا غالب کے بے اولاد ہونے کی بنا پر ویران گھر کے حوالے سے، بہرحال یہ غم اور تنہائی کے بیان کا شعر ہے۔ لہٰذا اس طرح کے قرائن اگر غزل کے ایک شعر میں موجود ہوتے ہیں اور اضافیت اور تعدد کے دائرے کو تنگ کرتے ہیں تو اس کلام کے بارے میں معاملہ اور بھی سخت ہوگا جو سنجیدگی سے ایک پیغام پہنچانے کے لیے تحریر یا تقریر کی شکل میں ہو۔

قرآن مجید بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے، جو ایک واضح پیغام پہنچانے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ اس میں یقیناً ایسے ہی قرائن موجود ہیں، جو کلام کو منشائے متکلم کے لیے قوی الدلالت بناتے ہیں۔ میں یہاں کلام کے داخلی قرائن کے وجود کے ساتھ کچھ ایسے عناصر کی طرف اہل علم کی توجہ دلانا چاہتا ہوں، جو اس کلام کی ساخت (structure) سے تعلق رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنے کلام کو واضح تر بنانے کے لیے بہت سے عناصر سے کام لیا ہے، تاکہ اس کا سامع یا قاری اس کی بات کو سمجھ سکے۔ ان عناصر کو ہم اپنی اس تحریر میں ابلاغی ادوات کا نام دے رہے۔ یعنی ایسے آلات جو کلام میں ابلاغ کی صلاحیت بڑھاتے ہیں۔ ہر مصنف جو ابلاغ کے لیے کوئی تحریر تخلیق کرتا ہے، وہ انھی ادوات سے کام لیتا ہے۔ لیکن انسانی قابلیت کی ایک حد ہے۔ وہ بسااوقات ان ادوات سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہوتی، اور اگر واقف ہو بھی تو ان سب کو برت سکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ موثر ادیب وشاعر وہی ہوتا ہے جو ان ادوات میں سے زیادہ سے زیادہ کو اپنا سکے، اور اپنے کلام میں ان ادوات کے برتنے میں حسن کلام کو بھی قربان نہ ہونے دے۔ وضوح کی آخری سطح یہ ہوتی ہے کہ کلام کے ممکنہ معانی میں سے ایک معنی کی طرف لے جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ قرائن کلام میں رکھ دیے جائیں۔

قرآن مجید میں ان عناصر کا استعمال آخری سطح پر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بات نئی ہے، مگر میرے خیال میں قرآن کا معجزہ یہی ہے کہ اس نے ایک انسانی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا مگر ان تمام عناصر کو استعمال کیا، جو ابلاغ کو آخری سطح تک لے جاتے ہیں۔ اگلی سطور میں ہم انھی عناصر کو بیان کریں گے۔

قرآن مجید کے ابلاغی ادوات

قرآن مجید کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو عناصر چنے ان میں کلام کی ساخت سے بھی متعلق ہیں، اسلوب واداسے بھی متعلق ہیں اور کچھ خود عربی زبان کے بعض خاص خصائص میں سے بھی ہیں۔

زبان کا چناؤ

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لیے انسانی زبانوں میں سے وہ زبان چنی، جو دیگر زبانوں کے مقابلے میں معنی کے تعدد کو کم کرنے کیے لیے کچھ زیادہ ہی صلاحیت رکھتی ہے۔ غالباً عربوں کا یہی لسانی شعور تھا، جوانھیں یہ فخر عطا کرتا تھا کہ ہم اہل سخن ہیں اور باقی لوگ گونگے یا عجمی ہیں۔ عربی زبان میں بہت سی ایسی خوبیاں ہیں، جو اسے اس معاملے میں دیگر زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے چند ایک خصائص کا ذکر کریں گے، جو کلام کی اس دلالت سے متعلق ہیں، یعنی جو تعدد اور اضافیت معنی کو روکتی ہیں۔

عربی کے خصائص

اعراب

عربی زبان وہ ہے جس میں گرامر کے لحاظ سے آنے والی تبدیلیاں الفاظ پر سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ عربی میں ہر طرح کے نحوی محل بدلاؤ کے وقت لفظ پر زیر زبر یا پیش یا دیگر اعرابی علامتوں میں سے کسی نے آنا ہوتا ہے، اعراب کے یوں اظہار سے اس لفظ کی نحوی (grammatical) حالت کا زیادہ واضح ادراک ہوتا ہے۔ گرامر کی یہ تبدیلیاں کلام میں لفظ کی معنوی حالت کو واضح کرنے میں بہت مد ہیں، جس سے کلام میں تعدد معنی کا امکان کم ہو کر وہ متکلم کے منشائے کلام کو زیادہ واضح کرنے کے لائق ہو جاتا ہے۔

مفصل صیغے

عربی زبان کی ایک اور خاصیت اس پہلو سے یہ ہے کہ اس کے افعال کی گردانیں (forms) اور ضمائر (pronouns) کے صیغے وغیرہ دیگر زبانوں سے زیادہ تفصیلی ہیں، اس سے عربی افعال اور ضمائر میں مذکر، مؤنث، غائب وحاضر اور واحد وجمع وغیرہ کی تعین کے امکانات دیگر زبانوں سے زیادہ ہوجاتے ہیں۔ اس لیے مرجع ہائے ضمائر اور فاعل ومفعول کے پہلو سے عربی زیادہ سہولت سے معنی کے تعین میں مددگار ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ البقرہ میں **عرضھم علی الملائکة** میں **عرضھم** کی ضمیر مفعول ذوی العقول کی طرف اشارہ کرتی ہے، جبکہ اس کا مرجع **الاسماء** کا لفظ ہے۔ جس کے لیے ھم کی ضمیر براہ راست آنا درست نہیں ہے، سوائے اس کے کہ **الاسماء** بول کر ذوی العقول مسمی مراد لیے گئے ہوں۔ چنانچہ ہم اس ضمیر کی مدد سے، اس تفسیر کو رد کر سکتے ہیں، جو ان اسماء سے غیر ذوی العقول چیزوں کے نام مراد لیتی ہے۔ اس طرح اور بھی خوبیاں ہیں، جیسے تثنیہ وغیرہ جنھیں مضمون کی طوالت سے بچنے کے لیے میں یہاں لکھنے سے گریز کر رہا ہوں اور اس لیے بھی کہ اہل علم باقی سب چیزوں کو اس لحاظ سے خود سمجھ سکتے ہیں۔

قرآت

اس کے بعد قرآن مجید نے جو تعدد معنی کو روکنے کے لیے اگلا اہم کام کیا ہے، وہ قرأت ہے، قرأت اگرچہ ہر زبان میں اہمیت رکھتی ہے مگر عربی میں یہ اوپر بیان کردہ خصائص کے ساتھ مل کر تعدد کو روکنے میں مزید مؤثر ہوجاتی ہے۔ اعراب اور صیغوں میں عربی کے مذکورہ بالا خوبی کے باوجود کچھ ابہام کے مقامات رہ جاتے ہیں۔ مثلاً **ذھبت** کا صیغہ واحد مؤنث غائب، مؤنث حاضر اور مذکر حاضر تینوں کے لیے ہوسکتا ہے اگر اس کے تعین کو شارح پر چھوڑا جائے تو وہ تینوں میں سے کسی کو سیاق وسباق کی روشنی میں اختیار کرسکتا ہے۔ بعض مواقع پر تو تینوں میں سے ہرایک کے لیے جانے امکان موجود ہوسکتا ہے۔ اس کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ چیز اختیار کی کہ اس کو لکھا ہوا اتارنے کے بجائے سنا کر نازل کیا گیا۔ اسی عمل کو سورہ قیامہ میں **ان علینا جمعه وقرآنه** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے(۷) یعنی جو چیز قاری یا شارح نے طے کرنی تھی، وہ خود متکلم نے طے کردی کہ میں اس لفظ پر زیر پڑھ رہا ہوں، جزم یا زبر وغیرہ۔ اس سے جملے میں لفظ کے اعرابی محل کا تعین گویا خود متکلم نے کردیا۔ اسی چیز کی اہمیت کو صحابہ نے محسوس کیا تو انھوں نے نہ صرف کلام الٰہی کے نسخے لکھوائے بلکہ ساتھ حفاظ بھی بھیجے تا کہ قرأت بھی ساتھ ہی منتقل ہو۔ اسی چیز کو بعد میں اعراب لگا کر متعین کردیا گیا۔

اب یہ بات کلام الٰہی میں متعین ہوگئی کہ جملے کے ہر ہر لفظ کو کس نحوی محل میں بولا گیا ہے۔ مثلاً یہ جملہ کہ **انما یخشی الله من عباده العلماء** میں، اگر شارح پر چھوڑا جائے تو **العلماء** پر رفع بھی پڑھا جاسکتا ہے، اور نصب بھی۔ چنانچہ اگر قران قرأت سے نہ آیا ہوتا تو مثلاً اس کے **العلماء** پر نصب اور لفظ اللہ پر رفع پڑھ کر نظریہ شفاعت کے غلط نظریے کو نص فراہم کی جاسکتی تھی۔ لیکن قرأت سے منتقل ہونے کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اعراب اور مفصل صیغوں والی زبان کو چنا اور دوسرا کام یہ کیا کہ اس کی بذریعہ **جبریل علیه السلام** قرأت کرائی تا کہ جمل وآیات میں لفظ کی نحوی حالت منشائے الٰہی کے مطابق نبی اکرم **صلی الله علیه وسلم** تک پہنچ جائے۔ یہ کلام میں معنی کے تعدد کو کم کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ تھا، جو اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا۔ چنانچہ پورے اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرام **صلی الله علیه وسلم** کی زندگی کے آخری رمضان میں بیس دن کے اعتکاف میں پورے قرآن مجید کی تین دفعہ

قرأت کرائی تاکہ قرأت ہر طرح کی غلطی سے مامون ہو جائے (۸)، اور اللہ تعالیٰ کا منشائے قرأت آخری صورت میں نحوی تعینات کے ساتھ نبی اکرم اور امت تک پہنچ جائے (۹)۔

قرآن کے داخلی ابلاغی ادوات

اوپر کے امور کے بعد اب ہم ان امور پر گفتگو کریں گے، جو قرآن مجید نے اپنے مجموعے کی تشکیل کے وقت زبان اور ترتیب کے پہلو سے اختیار کیے۔ یہاں بھی میں کلام الٰہی کے صرف ان خصائص کا ذکر کروں گا، جو تعیین مدعا میں معاون ہیں:

عربی مبین

قرآن مجید میں عربی مبین استعمال کی گئی ہے (۱۰)۔ اس کے معنی واضح زبان کے ہیں۔ ہر زبان کی کئی سطحیں ہوتی ہیں، مثلاً ایک مشکل اور مغلق اور کم مستعمل زبان، جو ہمیں دور متوسط کی بعض کتابوں میں ملتی ہے، مثلاً مقامات حریری وغیرہ میں، اسے سمجھنے کے لیے اہل زبان کو بھی معجم ولغت سے کام لینا پڑتا ہے۔ زبان کی ایک وہ سطح ہے جسے ہم روز مرہ کی وہ زبان کہہ سکتے ہیں، جس میں اہل زبان عام گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک بازاری اور دوسری مہذب اور فصیح، لیکن یہ دونوں قسمیں روزمرہ کے استعمال میں ہونے کی وجہ سے نہایت سہل، عام فہم اور قرآن کے الفاظ میں مبین ہوتی ہیں۔ قرآن مجید نے اسی دوسری سطح کی زبان کی دوسری قسم کو اپنے پیغام کے لیے استعمال کیا ہے، یعنی مہذب، آسان اور روزمرہ کی زبان۔ چنانچہ اس کے مفردات، مرکبات، جمل اور اسالیب روزمرہ کے استعمال میں ہونے اور زبان زد عام ہونے کی وجہ سے آسان فہم اور سریع المفہوم ہوتے ہیں۔ زبان کے اس حصے میں شاذ اور غریب الفاظ واسالیب کا دخل نہیں ہوتا (۱۱)۔ اس لیے اس کے معنی تک پہنچنے میں کوئی دقت اہل زبان مخاطب کو نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اس بات کو بار بار بیان کرتا ہے کہ قرآن عربی مبین میں ہے، اور اس کے معنی تک پہنچنے میں کوئی کج پیچ نہیں ہے (۱۲)۔

زبان کا یہ حصہ متواترات میں سے ہوتا ہے، اس کے اسالیب ومفردات مسلسل اہل زبان کے ہاں مستعمل رہنے کی وجہ سے شناسائی سے محروم نہیں ہوتے۔ اس کی اس خوبی کی وجہ سے ایسا کلام ہمیشہ زیادہ قابل فہم ہوتا ہے۔ اس سطح پر واضح زبان پر وہ اعتراضات لاگو نہیں ہوتے جو نقل زبان سے متعلق اسلاف کے حوالے سے ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔

یک معیاری زبان

عربی مبین میں بھی ابہام رہ سکتا ہے، اگر یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس علاقے کی عربی مبین ہے اور اس میں کس علاقے کے روز مرے اور محاورے کو استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے ہماری اردو میں دہلوی ولکھنوی اور انگریزی میں امریکی وبرطانوی لہجے ہیں۔ اب اگر ایک مصنف لکھتے وقت برطانوی اور امریکی لہجے کو بلاامتیاز استعمال کرتا جائے تو اس کے بعض جملوں میں سوال پیدا ہو جائے گا، کہ مصنف کا ارادہ امریکی تھا کہ برطانوی۔ جس سے بسا اوقات معنی پر بھی فرق پڑ جائے گا۔ عربوں کے ہاں بھی زبان کے مختلف لہجے اور بولیاں تھیں۔ اس انتشار سے بچنے کے لیے قرآن مجید نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان (قریش) کی زبان اختیار کی (۱۳)، تاکہ اسلوب، محاورے، روزہ مرہ اور لفظ کے معنی کے تعین میں اسی قبیلے کی زبان کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کی زبان کے خالص ہونے کی خوبی وہی ہے، جو قرآن مجید نے اپنی ہدایت کے بے آمیز ہونے کی تمثیل میں ایک مشکاۃ کے تیل کے لیے بیان کی ہے کہ لاشرقیۃ ولاغربیۃ (۱۴) نہ وہ شرقی ہے نہ غربی، یعنی بے آمیز زبان۔ یہ اصول بھی قرآن مجید کے معنوی ابلاغ کو ابہام وظن سے بچاتا ہے کہ اب ہم قرآن مجید کے لیے قریشی نحو، صرف، بلاغت وفصاحت کو حجت مانیں گے۔

سیاق سباق

نزول قرآن کے وقت آیات کی ترتیب نزول کیا تھی، اس کے بارے میں آج کچھ کہنا ناممکن نہ سہی، مشکل ضرور ہے۔ لیکن آج جو ترتیب ہمارے پاس ہے وہ خود فہم معنی میں ممد ومعاون ہے۔ سیاق اور سباق (context) دراصل وہی کام کرتا ہے جو جملہ لفظ کے ساتھ کرتا ہے (۱۵)۔ مثلاً ذیل میں دو جملے بطور مثل عرض کر رہا ہوں، دونوں میں گولی کھائی کے الفاظ جملے میں اپنے ''سیاق سباق'' سے معنی بدل رہے ہیں:

اس نے گولی کھائی اور جانبر نہ ہو سکا۔۔۔۔۔۔

اس نے گولی کھائی اور پھر سر درد کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔۔۔

’’گولی کھائی‘‘ کے الفاظ کے ساتھ جو عمل ’’جانبر نہ ہو سکا‘‘ اور ’’پھر سر درد کا کچھ اتا پتا نہ تھا‘‘ سے بننے والے سیاق نے کیا ہے، اور ان کے دونوں جملوں میں معنی مختلف کر دیے ہیں، یہی کام جملے کے لیے پیراگراف یا جملے کا موقع محل کرتا ہے۔ پھر پیراگراف کے لیے اس کا موقع محل، اور یوں پورا مضمون اپنے موقع محل سے تعینات حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور ہم ہر ہر جز کو کلام کے اندر رکھ کر اس کے معنی کو سمجھتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن مجید کی توقیفی ترتیب یہی کردار ادا کرتی ہے۔

سیاق سباق اور موقع محل تعیین معنی کے لیے اس قدر اہم ہیں کہ معنوی مراد کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔ مثلاً اوپر کے جملوں میں سے پہلے جملے کو اگر ہم اخبار کا جملہ مان لیں تو اس کے معنی میں اس پہلو کا اضافہ ہو گیا کہ یہ ایک خبر ہے، اسے اگر ناول یا افسانہ کا حصہ مان لیں، تو یہ محض کہانی کا حصہ بن جائے گا۔ گویا سیاق وسباق جملے کا ہو یا پورے مضمون کا، اس سے بھی معنی میں تبدیلی وجود میں آتی ہے، اور اگر پورے موضوع سے یا اس کے محل اور موقع ورود- جیسے اخبار اور ناول- سے سیاق وسباق بنے تو تب بھی معنی بدلتے جاتے ہیں۔ اس لیے تعیین معنی کے اعتبار سے اس سیاق وسباق کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ترتیب توقیفی کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ ہر آیت اس پہلو سے اپنے مقام میں جڑے ہوئے نگینے کی طرح ہے، اگر اسے وہاں سے اٹھا دیں تو معنی تو وہ پھر بھی دے گی لیکن اس حسن سے محروم ہو جائے گی جو اس کا مقام اس کو دے رہا تھا، وہ حسن اس کے اصل معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ **رضوان اللہ علیھم**۔ سیاق وسباق کو اہمیت دیتے تھے۔

سورہ الکوثر، اگر اپنے موقع محل سے اٹھا لیں تو اس کے معنی سادہ الفاظ میں صرف اتنے ہیں کہ آپ کو کوئی خیر کثیر عطا کیا جا رہا ہے اور آپ نماز پڑھا کریں اور قربانی کیا کریں اور آپ کے دشمن کی جڑ کٹ جائے گی۔ لیکن اگر اس کو اس کے موقع محل میں رکھ دیں تو اس میں وہ ایک جامع سورہ کی طرح بڑے مضمون کی حامل سورہ ہے۔ یہاں تفصیل میں جانا ناممکن ہے لیکن سیاق وسباق کی چند دلالتوں کی طرف اشارہ پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ.

یہ تین جملے ہیں ان میں جو سیاق وسباق بنانے والی چیزیں ہیں وہ بھی مختصر ہیں۔اس لیے فہم کے لیے ان کی گرفت آسان ہے، اس لیے میں نے یہ سورہ مثال کے لیے چنی ہے۔ **اعطیناک** میں **ک** سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں اس سورت میں آپ ﷺ کو دین میں سے صرف دو چیزوں (**فصل اور وانحر**) کا حکم دیا جا رہا ہے نہ زکوۃ نہ روزہ نہ کوئی اور حکم اور پھر آپ کے دشمن کا ذکر ہے کہ وہ ابتر ہوگا۔

سیاق وسباق کے ان نشانات سے ہماری راہنمائی کس طرف ہوتی ہے۔ اس کو سمجھنے سے پہلے ایک مثال پر غور کریں کوئی اپنے بیٹے کو ایک چیز بھیجنے کا وعدہ کرے اور لکھے:

’’میں تمھیں ایک بہت فائدہ مند چیز بھیج رہا ہوں،
پس کلائی پر باندھ لینا اور وقت پر سکول
پہنچنا، استاد تمھیں سزا نہیں دے گا‘‘

خط کے اس جملے میں بھیجی جانے والی چیز کا نام نہیں لیا گیا۔ لیکن آگے دو حکم ایسے دیے گئے ہیں کہ جس سے اس چیز کے بارے میں وضاحت مل رہی ہے کہ وہ ہاتھ پر باندھنے کی گھڑی ہے۔ اب سورہ الکوثر کے تینوں جملے سامنے رکھیں:

’’ہم نے تمھیں (الکوثر) خیر کثیر والی چیز عطا کی پس
نماز پڑھنا اور قربانی دینا، بے شک تیرا دشمن جڑ کٹا
ہو رہے گا‘‘

اس جملے میں بھی دیکھیے کہ دو حکم دیے گئے ہیں ان دو حکموں کو کس چیز سے متعلق ہونا ہے وہ متعین ہو گئے تو الکوثر کے معنی واضح ہو جائیں گے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ نماز اور قربانی کہاں اکٹھے ہوتے ہیں، بیت اللہ میں چنانچہ جب یہ سورہ اتری تو آپؐ کے دشمن کعبے پر قابض تھے۔ چنانچہ آپ کو بشارت دی گئی کہ آپ کو بیت اللہ عطا کیا گیا ہے اب اس میں جا کر نماز پڑھیے اور قربانی دیجیے اور رہا اس وقت کا قابض دشمن تو گھبرائیے نہیں وہ خائب وخاسر ہوگا۔ یعنی قریش اور اس کی لیڈر شپ ماری جائے گی اور ان کے قبضے سے بیت اللہ آزاد ہو جائے گا۔ تو پھر آپ حج کرنے جائیں گے۔ وہاں نماز پڑھیں گے اور قربانی دیں گے(۱۶)۔

اب سورہ کے موقع محل میں جائیں تو اس سے پہلے دو سورتیں ہی دیکھیں تو سورہ قریش اور الماعون ہے، سورہ قریش سے اور الماعون سے دشمن کے مصداق کا تعین ہوتا ہے کہ وہ قریش میں سے ہیں اور وہ منکر روز جزا ہیں بخیل اور ریاکار ہیں، وغیرہ اور دو سورتیں بعد میں دیکھیں تو سورہ الکافرون ہے اور سورہ نصر ہے اور اس کے بعد سورہ ابی لہب ہے۔ سورہ الکافرون دشمن کی حالت کفر کو اور سورہ نصر فتح مکہ کو متعین کرتی ہے اور سورہ ابی الہب قریش کے اس وقت کے بڑے لیڈر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر دیتی ہے۔ گویا ماقبل اور مابعد کی سورتیں بھی الکوثر کے بارے میں متعین کر رہی ہیں کہ وہ بیت اللہ ہے جو اس وقت قریش کی بداخلاق قیادت کے کنٹرول میں ہے۔ وہ عنقریب آپ کے قبضے میں آ جائے گا اور آپ کو نصرت وفتح حاصل ہوگی اور آپ کا دشمن ابولہب عبرت ناک طریقے سے خود بھی مرے گا اور اپنے ساتھیوں سے بھی محروم ہو جائے گا۔

سیاق وسباق کی یہ دلالت اس قدر اہم ہے کہ کلام کے مخفی پہلوؤں کو کھول کر سامنے لے آتی ہے۔ کلام الٰہی نے یہ دوہری تہری سیاق وسباق کی تہیں اپنائی ہیں:

۱۔ جملے کے اندر کے کا سیاق وسباق۔

۲۔ پورے پیراگراف کا سیاق وسباق۔

۳۔ سورہ سے پہلے اور سورہ کے بعد کی سورتیں۔

اس سہ گونا سیاق سباق کو تخلیق کر کے قرآن مجید نے اپنے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے ایسے قرائن کلام میں رکھ دیے ہیں کہ اس کا مخاطب بالخصوص مخاطب اول تعیین مدعا میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب بعد کے قاری کے لیے بھی اس میں ایسے نشانات راہ ہیں کہ محنت کر کے منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔

تصریف آیات

یہ بھی قرآن مجید کا نہایت مؤثر آلہ ہے بات کو تعدد معنی اور الجھن سے بچانے کا، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک ہی مضمون کو کئی پہلوؤں سے دہرایا ہے، مثلاً مختلف الفاظ میں وہی بات انھی الفاظ میں مگر مختلف سیاق وسباق میں، کبھی الفاظ میں تبدیلی سے اور کبھی سیاق وسباق میں تبدیلی سے وغیرہ۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک طرح کے الفاظ سے جب بات سمجھ میں نہ آئے تو دوسرے الفاظ سے آجائے گی اور ایک سیاق میں اس کا ایک پہلو واضح ہوگا تو دوسرے میں اس کا دوسرا پہلو۔

یہ عنصر ایک کائناتی حقیقت کی طرح ہے مثلاً جب ہم کشش ثقل کو مانتے ہیں تو پھر مادے کی ہر جگہ اور ہر حالت میں اس کشش کا ثابت ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اگر چاند پر جا کر معلوم ہو کہ پتھر اوپر بھی گرتا ہے اور نیچے بھی تو کشش ثقل کا ضابطہ باطل مانا جائے گا۔ ٹھیک قرآن مجید میں ایک جگہ آئی ہوئی بات کا مفہوم لازم ہے کہ ہر جگہ غلط قرار نہ پائے۔

قرآن مجید میں تصریف آیات لفظی بھی ہے اور موضوعاتی بھی۔ لفظی کا مطلب یہ ہے کہ بعینہ الفاظ دہرائے گئے ہوں، صرف سیاق وسباق بدلا ہو، اور موضوعاتی کا مطلب یہ ہے کہ مضمون کو دہرایا گیا ہو، الفاظ اور سیاق وسباق دونوں یکسر بدل گئے ہوں۔ لفظی تصریف کی ایک مثال سورہ بقرہ اور سورہ السجدہ کا آغاز ہے۔ ذیل میں لاریب فیه کے معنی کیا ہیں متعین کرنا کافی مشکل ہے۔ اگرچہ قرائن صاف ہیں کہ اس سے مراد یہ کہ اس کے کلام الٰہی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ 2:2)

یہ کتاب اس میں کچھ شک نہیں ڈرنے والوں کی رہنما ہے

لاریب فیه کا محل سورہ البقرہ میں کیا ہے، غور سے واضح ہوتا ہے۔ سورہ السجدۃ میں اسے لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے جس سے ہمارا اس مفہوم پر اطمینان ہو جاتا ہے کہ لاریب فیه کے معنی یہی ہیں کہ اس کے کلام الٰہی ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (السجدہ 32:2)

اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کا نازل کیا جانا تمام جہان کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

لفظی تصریف کے بعد ہم یہاں موضوعاتی تصریف کی مثال دیں گے جس سے یہ واضح ہوگا کہ کلام اور سیاق وسباق کی دلالتوں سے معنی کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے اور یہ بھی کہ موضوعاتی تصریف سے ہماری کیا مراد ہے۔

سورہ فاتحہ میں الرحمن الرحیم کی صفات کے بعد مالك یوم الدین کا ذکر آیا ہے، یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ جس سے قیامت کا ظہور صفتِ رحمت کا تقاضا لگتا ہے۔ مثلاً دوسرے مقام پر ذکر ہے کہ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ. (الانعام 6:12) یعنی (اللہ نے اپنے اوپر رحمت فرض کر رکھی ہے اس لیے وہ قیامت کے دن تم سب کو ضرور اکھٹا کرے گا اس میں کچھ شبہ نہیں ہے)۔ اب دیکھیے کہ فاتحہ کے ابتدائی جملوں کی معنویت کا ایک پہلو تو سورہ فاتحہ سے واضح تھا ہی مگر رحمت اور قیامت کے اس باہمی تعلق نے جو آیت رحمت سے ظاہر ہو رہا ہے کچھ اور ہی گہرے معنی سورہ کی ابتدائی آیات میں پیدا کر دیے ہیں۔ وہ مختصراً یہ ہیں کہ رحمت دراصل عدل کا تقاضا کرتی ہے اور عدل صرف یہ نہیں ہوتا کہ مظلوم کی دادرسی کر دی جائے عدل لازمی تقاضا کرتا ہے کہ مجرم کو سزا بھی دی جائے۔ چنانچہ رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ

۱۔ عدالت لگائی جائے اور جرم و بے گناہی کو ثابت کیا جائے

۲۔ عدالت کے فیصلے کے بعد بے گناہوں کی معافی اور مجرمین کو سزا دی جائے

چنانچہ پہلے تقاضے کا جواب قیامت کے دن کا قیام ہے اور دوسرے تقاضے کا جواب جنت ودوزخ ہے۔ سورہ فاتحہ قرآن مجید کی تمہید میں اس بات کی بنیاد رکھ رہی ہے کہ تم خدائے "الرحمن الرحیم" کی دنیا میں رہتے ہو، اس لیے رحمت کے تقاضے قیامت کو لازم سمجھو اور اس کے لیے تیاری کرو۔ یہ ایک مختصر مثال ہے کہ قرآن مجید میں موضوعات کی تصریف کس طرح ہوئی ہے۔ لفظی تصریف آسان ہے لیکن موضوع کی تصریف زیادہ مؤثر ہے۔ قرآن مجید کی تصریف آیات کے یہ دونوں پہلو سامنے رہنے چاہیں:

۱۔ یہ کہ وہی الفاظ نئے سیاق وسباق میں دہرائے جائیں۔

۲۔ یہ کہ وہی مضمون دوسرے مقامات میں نئے الفاظ وسیاق میں لایا جائے۔

تصریف آیات کے طریقے پر مباحث کی تکرار دراصل ایک طرف معنی میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس میں غلط معنی کے ورود کی راہ مسدود کرتی ہے۔ مثلاً اوپر کی دونوں آیات کے بعد اب قرآن مجید میں رحمت کا یہ تصور ڈالنا مشکل ہو جائے گا کہ اللہ چاہے تو سب کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں ڈال دے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ تصور رحمت کے تقاضے عدل کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ سزا کا نفاذ رحمت کا لازمی حصہ ہے۔ چنانچہ یہ آیت کہ ''کتب علی نفسه الرحمة ليجمعنكم الى يوم القيامة'' رحمت کے مضمون کے لیے ایک فصیل کی طرح ہے پورے قرآن مجید میں تفسیر آیات کے وقت نہ رحمت میں کسی ایسے پہلو کو داخل ہونے دے گی جو اس سے ٹکرائے اور نہ ایسے پہلو کو نکلنے دے گی جس سے اس کی نفی ہو۔

عدم تضاد

قرآن مجید نے ایک وصف اپنا یہ بیان کیا ہے کہ اس میں تضاد نہیں ہے ''ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً''(۱۷)۔ یہ اصول ایک طرف اس کے الہامی ہونے کی دلیل ہے تو دوسری طرف یہ قرآن کے ایک وصف کا بھی بیان ہے۔ اب اگر کوئی آدمی کسی آیت کی ایسی تفسیر کرے جو قرآن کے کسی دوسرے مقام سے ٹکراتی ہو تو وہ درست تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اس لیے یہ بات بھی قرآن مجید کے معنی کے تعین میں [illegible]دگار ہے کہ وہ کس مقام پر کیا کہنا چاہتا ہے۔

تبیین الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ [illegible] تھا کہ نزول قرآن کے دوران میں کلام الٰہی کی دلالت یا اس کے مفہوم کے تعین میں اگر کہیں لوگوں کو مشکل محسوس ہوگی تو اس کی تبیین بھی کی جائے گی۔ سورہ قیامہ کی آیت جمع جو ہم نے اوپر نقل کی ہے اسی میں اس کا وعدہ ہے کہ ثم ان علينا بيانه یعنی پھر اس کی توضیح کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بہت سے مسائل کا جواب دیا گیا ہے جن کا آغاز يسئلونك (۱۸) کی طرح کے الفاظ سے ہوتا ہے یا ان کے اختتام پر کچھ اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں كذلك يبين الله آياته(۱۹) اور یوں اللہ اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ تعیین معنی کے لیے خود متکلم کا بیان ہوتا ہے جس سے مدعائے کلام کا تعین مزید آسان ہو جاتا ہے۔

محکم اور مفصل آیات

قرآن نے اپنا ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کی آیات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو محکم ہیں اور دوسری وہ جو مفصل ہیں۔ محکم یہاں مفصل کے مقابلے میں آیا ہے اس لیے بالعموم مفسرین نے اسے مختصر آیات کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی آیات کی ایک قسم وہ ہے جن میں نہایت ایجاز کے ساتھ بات کہی گئی ہے اور پھر اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ یہ نہایت دلچسپ معاملہ ہے۔ یعنی قرآن مجید نے اصولی آیات اور پھر ان کی تفصیل کر کے یہ بتا دیا کہ میری اس بات کا کیا مطلب ہے۔ مثلاً سورہ عصر میں کہا گیا ہے کہ زمانہ گواہی دیتا ہے کہ اہل کفر خسارے میں رہے اور اہل ایمان خسارے سے بچے رہے۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل کیا ہے یہ قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر کی گئی ہے مثلاً سورہ ہود میں دیکھیے کہ فرمایا:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَالْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ(ہود11:66)

''جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے صالح کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے ان کو اپنی مہربانی سے بچا لیا۔ اور اس دن کی رسوائی سے (محفوظ رکھا)۔ بے شک تمہارا پروردگار طاقتور اور زبردست ہے''

پورا قرآن مجید اس طرح کی تفصیلی آیات سے بھرا ہوا ہے کہ کس کس طرح اہل ایمان کو بچا لیا گیا اور کس طرح اہل کفر پر عذاب آیا۔ لیکن یہ اہل ایمان کا بچاؤ اس وقت ہوا جب کوئی رسول ان کے بیچ میں تھا۔ جیسے محولہ بالا آیت میں نجينا صالحاً والذين آمنوا معه کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ گویا رسولوں کے زمانے کا یہ فیصلہ کہ اہل ایمان بچا لیے گئے اور اہل کفر مارے گئے یہ خیر و شر کے معاملے میں خدائی مداخلت کا ثبوت ہے چنانچہ متنبہ رہو کہ آخرت میں بھی ایسا ہوگا۔

اجمال و تفصیل کا یہ تعلق بھی تعیین مدعا اور فہم کلام کے لیے

نہایت مؤثر ہتھیار ہے۔ اس کے ذریعے سے کلام کا مدعا مختصر الفاظ میں جب سامنے آتا ہے تو یوں سمجھیے کہ آپ نے بڑے منظر کو کیمرے میں بند کردیا ہے، جس سے بات کو مجموعی طور پر گرفت میں لینا آسان ہوجاتا ہے اور جب اس کی تفصیل سامنے آتی ہے تو گویا آپ اس کے ایک ایک جزو کو سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ چند ایک وہ امور تھے جو قرآن مجید کو عام کلام سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ امتیاز اس پہلو سے ہے کہ قرآن اپنے مدعا کو الفاظ، کلام کی ساخت، زبان کی ابانت، سیاق وسباق کی بندش، معنی کے بیان اور احکام وتفصیل کے ذریعے سے معنی کی جامعیت اور اجزا کی تفہیم کو اپنے قاری کے لیے ممکن بناتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے سے قرآن مجید نے اپنے آپ کو بینات من الھدیٰ اور فرقان بتایا(۲۰) اور اپنے مخاطبین پر اتمام حجت کیا اور بات کو اس قدر واضح کردیا کہ ارشاد ہوا کہ رسولوں کے بعد انکار حق کی کوئی دلیل باقی نہیں رہتی(۲۱)۔ قرآن مجید کی اسی خوبی کی وجہ سے قرآن یہ دعوائے حق کرتا ہے کہ اس کی آیات سے غلط معنی مراد نہیں لیے جاسکتے کلام میں ایسے قرائن ہوں گے کہ اس غلط معنی کو رد کردیں گے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَّا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ م بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ. تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ(حم السجدة41:42)

''اس پر (تاویل) باطل کا دخل نہ آگے سے ہوسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ (اور) دانا (اور) خوبیوں والے (اللہ) کی اتاری ہوئی ہے''

یعنی یہ ایسی ہستی کی تخلیق ہے کہ اس میں یہ خامی موجود نہیں ہے کہ مفسر غلطی کرے اور پکڑی نہ جائے۔ ہر کلام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایک حد تک غلط معنی کے تعیین میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ لیکن علیم وحکیم ذات کا تخلیق کردہ کلام اس میں کہیں آگے ہے۔

مغربی اہل تفسیر (hermeneutists) کے لیے اوپر کی بحث کی روشنی میں پیغام یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ درست ہے کہ کلام کے معنی لوگ مختلف لیتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ کلام کے معنی لینے میں شارح کو برابر کی حیثیت دے دی جائے۔ اس میں کلام کی حیثیت اول اور فیصلہ کن ہونی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ دنیا میں سب کلام ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنے مدعا کے ابلاغ کی قوت کم رکھتے ہیں۔ بلکہ ایسے کلام بھی ہیں جو اعلیٰ ترین سطح پر ابلاغ کا اہتمام رکھتے ہیں۔

اوپر کی گفتگو کی روشنی میں اہل فقہ کی خدمت ہم یہ عرض کریں گے کہ فقہا کی تقسیم الفاظ باعتبار دلالت از سر نو مطالعہ کی محتاج ہے۔ دورجدید میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جدید فلسفیانہ (philosophy of language) لسانیاتی (linguistices) اور اصول تفسیر (hermeneutics) کی بحثوں کی روشنی میں اور قرآن کے اپنے بیان کردہ اوصاف اور خصائص کے تناظر میں تدوین اصول کی وہ راہ اختیار کی جائے جو سدید اور صائب ہو۔

عقل کے تجزیہ کی وہ کمزوری جو ہم نے شروع میں بیان کی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ہم جدید لسانی بحثوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظی دلالت کے اعتبار سے جدید آراء یقیناً صحیح ہوں گی، لیکن ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ عقلی تجزیات ہمیشہ اس بات کا امکان رکھتے ہیں کہ وہ غلط ہوں۔ اور اگر وہ صحیح بھی ہوں تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ وہ اس [illegible] کی نفی نہیں کرتے کہ کوئی کلام ایسا بھی تخلیق ہوسکتا ہے جو اپنے قاری [illegible] کے لیے اشتباہ کے امکانات کو ان کی آخری سطح پر ختم کردے۔ [illegible] کوئی ذات اگر ایسا کلام تخلیق کرنے کی قدرت کاملہ کا اظہار کر [illegible] دے کہ جس کی وجہ سے وہ کلام دلالت کے اعتبار ایک استثنائی [illegible] مقام حاصل کرجائے تو کیا بعید ہے۔

ہماری اوپر کی بحث میں یہی بات سامنے [illegible] لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید ایسا ہی ایک استثنائی کلام [illegible] ہے۔ اسے عام کلام کی طرح نہ سمجھا جائے اس لیے کہ [illegible]

حواشی

۱- الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، ج۱، ص۳۴۔

۲- آلوسی، روح المعانی، ج۱۲، ص ۲۷۔

۳- دیکھیے کشف الاسراء، ج۱: ص ۴۴، مسلم الثبوت، ج۲، ص ۱۹، التلویح علی التوضیح، ج۱، ص ۱۲۶۔

۴- کشف الاسرار، ج۱، ص ۶۷، ج۲، ص ۲۱۰، التلویح التوضیح، ج۱، ص ۱۲۹۔

۵- الاحکام للآمدی، ج ۲، ص ۱۸۸۔

۶- الرازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، ج۱، ص ۳۰-۴۳۔

۷- اس کی تدوین قرأت کی ذمہ داری ہم (اللہ) پر ہے (القیامہ ۱۶)۔

۸- صحیح بخاری، رقم ۴۹۹۸۔

۹- البرہان، الزرکشی: جلد۱، ص ۳۳۱، السیوطی، الاتقان، جلد۱، ص۱۸۴۔

۱۰- القرآن، الشعراء ۲۶: ۱۹۳-۱۹۵۔

۱۱- القرآن، الزمر ۳۹: ۲۸۔

۱۲- القرآن، الزمر ۳۹:۲۸

۱۳- القرآن، مریم ۱۹: ۹۷

۱۴- القرآن، النور ۲۴:۳۵

۱۵- قرآن نے یہود کو تین چار دفعہ اس بات پر سرزنش کی ہے کہ **یحرفون الکلم عن مواضعہ** وہ کلام یا الفاظ کو انہی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں (مثلاً النساء ۴:۴۶)

۱۶- مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ الکوثر، مجموعہ تقاریر از حمید الدین

۱۷- اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں ضرور بڑا اختلاف پاتے۔

۱۸- مثلاً دیکھیے القرآن، البقرہ ۲:۱۸۹

۱۹- القرآن، البقرہ ۲:۲۴۲

۲۰- القرآن، البقرہ ۲:۱۸۵

۲۱- القرآن، النساء ۴: ۱۶۵

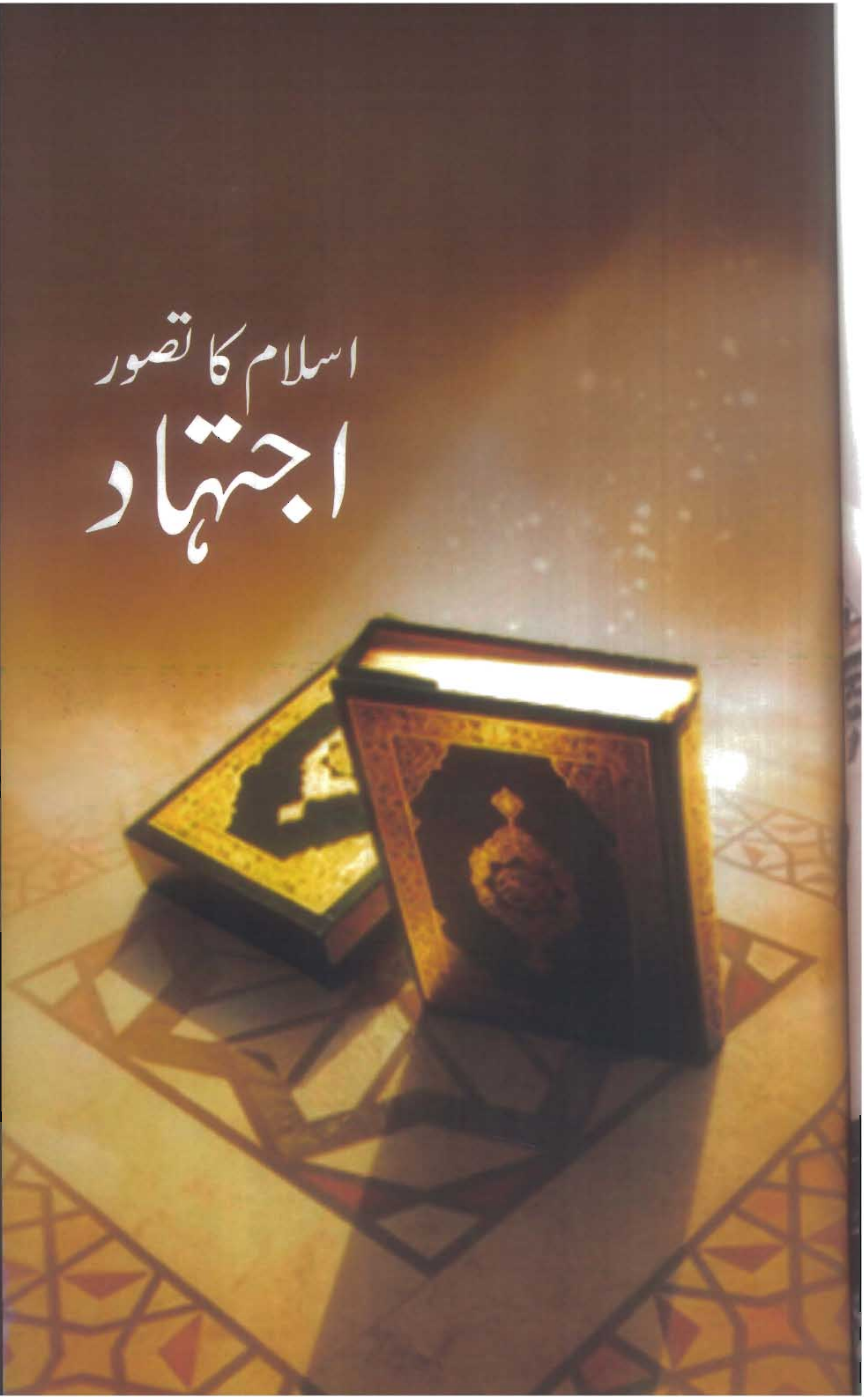

اسلام کا تصور اجتہاد

مولانا ابو الفتح محمد یوسف
ممبر اسلامی نظریاتی کونسل